رسولؐ اسلام کے کردار کا سیاسی مطالعہ

مرزا جعفر حسین مرحوم

علم سیاست نے تیرہ صدیوں کے ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد جو نئے تصورات دنیا کے سامنے پیش کیے ہیں اُن کے معیار سے عہدِ رسالت کے حالات کا جائزہ لینا کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہوسکتا اور نہ ایسا کرنا ہی ممکن ہے کیونکہ اس دور کے سارے معاشرے مائل بہ زوال تھے۔ عرب کے اردگرد کے ممالک اپنی عظمتوں سے دوری اختیار کرتے جارہے تھے۔ اور بنی نوع انسان شدید کشمکش میں مبتلا تھی۔ سلطنتوں پر شاہی تسلط تھا اور حکمرانی بادشاہوں کے فہم وفراست یا افتادطبیعت کے ماتحت ہوتی تھی۔ کسی ملک میں عدل و انصاف کارفرما تھا تو ظلم و جور کا بازار گرم رہنا بھی دوسرے ملکوں میں معمولی واقعہ ہوا کرتا تھا۔ اہل عرب، خاندانوں میں تقسیم تھے اور یہ خاندان ایک دوسرے پر اپنی روایات کے ماتحت اقتدار قائم کرنے کے لئے کوشاں رہا کرتے تھے۔ قبائل کی باہمی آمیزشیں رقابتوں کے حدود سے متجاوز ہوکر نفاق وعناد و عداوت تک بڑھ جاتی تھیں جن کا سلسلہ نسلاً بعد نسل چلا کرتا تھا۔ اسلام ان حالات کو سدھار نے آیا تھا اور حقیقت امر یہ ہے کہ رسولؐ اسلام نے ۲۳ برس کی قلیل مدت میں جو شدید ذہنی، معاشی اور اخلاقی انقلاب کامیابی کے ساتھ پیدا کردیا اس کی مثال تاریخ عالم میں کسی دوسری جگہ نہیں ملتی۔

ماہرین سیاست اگر جدید طرزِ حکومت چلانے کے اصولوں کو اسلام میں تلاش کرنا چاہیں گے تو اُن کو یقیناً مایوسی ہوگی اس لئے کہ اسلام سلطنتیں مٹانے آیا تھا، اُس کا مقصد سلطنت قائم کرنا نہیں تھا۔ رسولؐ اسلام نے ساری توجہ اس کوشش پر مبذول کررکھی تھی کہ دنیا میں انسانی برداری کا ایسا نظام قائم ہو جس کی بنیاد صلح و آشتی، امن و امان، اخوت ومحبت اور صداقت و دیانت پر رکھی جائے۔ اُن کے پیش کردہ اور جاری کردہ اصولوں میں کوئی گنجائش فتوحات اور دوسرے ممالک کے معاملات میں مداخلت کرنے کی نہیں تھی، انہوں نے ترویج اسلام میں بھی کبھی کسی قسم کے تشدد کو جائز نہیں رکھا۔ اُن لوگوں سے بھی جو اسلام قبول کرنا پسند نہیں کرتے تھے، رسولؐ اسلام کے فرستادہ ایلچی اتنا کہہ دینا کافی

سمجھتے تھے کہ اگر تم اسلام قبول نہیں کرتے تو اس کے شاہد رہو کہ ہم مسلمان ہیں، ملک گیری کا خیال تک کبھی اُن کے دماغ میں نہیں آیا اور آ ہی کیسے سکتا تھا جب کہ وہ یہ تعلیم دے رہے تھے کہ تمام روئے زمین اللہ کی ملکیت ہے اور یہاں حکومت الٰہیہ قائم ہونا چاہیے۔ اسی حکومت الٰہیہ کے زرین اصول انہوں نے پیغمبرؐ اسلام کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کئے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُن کی وفات کے بعد اُن کے ماننے والوں کی بہت بڑی اکثریت ہوس جاہ و جلال میں گرفتار ہوکر اُن اصولوں سے منحرف ہوگئی اس تبدیلی کو ہم کسی طرح بھی سیاست الٰہیہ میں شامل نہیں کرسکتے اس لئے ہم کو صحیح نتائج تک پہنچنے کے لیے اپنے سیاسی جائزہ کو بھی رسولؐ اسلام کے ارشادات اور عمل تک محدود رکھنا چاہیے۔

رسولؐ اسلام کو اپنی عمر کے چالیس برس گزارنے کے بعد شرف بعثت حاصل ہوا اور انہوں نے ذات واجب الوجود پر ایمان لانے کی ایک بہت مختصر مجمع کو دعوت دی۔ اس سلسلے میں مولانا شبلیؒ اپنی تصنیف سیرۃ النبیؐ میں تحریر فرماتے ہیں:

سب سے پہلا مرحلہ یہ تھا کہ یہ پُر خطر راز کس کے سامنے پیش کیا جائے؟اس غرض کے لئے وہ لوگ انتخاب کئے جاسکتے تھے جو فیض یاب صحبت رہ چکے تھے جن کو آپ کے اخلاق و عادات اور ہر ایک حرکات وسکنات کا تجربہ ہو چکا تھا، جو پچھلے تجربوں کی بناء پر آپ کے صدق دعویٰ کا قطعی فیصلہ کرسکتے تھے۔ ان لوگوں میں آپ کی حرم محترم حضرت خدیجہ، آپ کی آغوش تربیت میں پروان چڑھنے والے حضرت علیؑ آپ کے آزاد کردہ غلام حضرت زید اور خلیفۂ اول شامل تھے۔

مولانا شبلیؒ نیز دوسرے تمام مورخین کا اس بارے میں اتفاق ہے کہ مردوں میں حضرت علیؑ وہ بزرگ تھے جو سب سے پہلے ایمان لائے۔ اس مقام پر جملہ معترضہ کے طور پر یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ علیؑ کے ایمان لانے کا سوال اٹھانا ہی بے محل ہے۔ کتب تاریخ وسیر میں کہیں کوئی واقعہ ایسا نہیں ملتا جس سے علیؑ کا کفار قریش کے طور طریقوں کو اپنانا ثابت ہوتا ہو۔

اس لئے اُن کے بارے میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ با ایمان پیدا ہوئے صاحب ایمان رہے اور رسولؐ کی آواز پر بلا تامل لبیک کہنا اسی چھپے ہوئے ایمان کا اعلان تھا۔ اس دلیل کو اُس واقعہ سے بھی تقویت حاصل ہوتی ہے جب رسولؐ اسلام نے دعوت ذوالعشیرہ میں چالیس

آدمیوں کو جمع فرمایا تھا اور یہاں بھی علیؓ ہی وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے رسولؐ کی آواز پر لبیک کہی تھی ۔ بہرحال کچھ لوگوں نے اسلام قبول کیا مگر بہت بڑی تعداد جن میں ابوسفیان، ابولہب، ابوجہل وغیرہ جیسے با اثر لوگ اس نئے دین کی مخالفت پر کھل کر آمادہ ہوگئے۔ حقیقت امر یہ ہے کہ لاالہ الااللہ کے ایسے مختصر مگر پُر مغز کلمے کے جوہر پرکھنے اور اس کی معنویت سمجھنے کے لئے اُن لوگوں کے پاس نہ چشم بینا تھی اور نہ فہم و فراست۔ اس کے علاوہ کہنہ روایت کو، خواہ وہ کتنی ہی بوسیدہ اور فرسودہ کیوں نہ ہوگئی ہو، ترک کردینا آسان نہیں ہوتا کیونکہ وہ سارے سماج میں اس طرح اثرانداز اور پیوست ہوچکی ہوتی ہیں کہ افراد اگر خیرباد کہنے پر آمادہ بھی ہوں تو اپنے کو بے بس اور مجبور پاتے ہیں اس لئے رسولؐ اسلام کی ذات ہی کے خلاف طوفان عظیم برپا کردیا گیا لیکن آج ہم مقام مفاخرت میں کہہ سکتے ہیں کہ کلمۂ طیبہ کی بے پناہ طاقت، اسلام کی افادیت اور رسولؐ اسلام کی سیاست اور ان کے تدبر کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ممکن ہے کہ جس کلمہ کو ابتداءً تلخ اور ناگوار قرار دیا گیا تھا وہ جانِ ایمان ہوگیا اور اسلام آج دنیا بھر میں ایک مستند اور مضبوط مذہب کی حیثیت کا مالک ہے۔

سیاسی طریقہ پر دورِ رسالت کو دو علیحدہ علیحدہ تاریخی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جن میں بعثت کے بعد تیرہ برسوں پر مشتمل وہ پہلا حصہ ہے جو رسولؐ اسلام نے مکہ میں بسر کیا، ان تیرہ برسوں میں سے تخمیناً تین سال سے زائد اس طرح گذرے تھے کہ رسولؐ اسلام کے لئے شعب ابوطالب سے باہر نکلنا بھی آسان نہ تھا۔ یہ دور خاموش تبلیغ کا زمانہ تھا جو رسولؐ اسلام اپنے سلیقہ سے نباہ لے گئے اور اپنے تدبر و ہوشمندی سے اپنے مشن کو آگے بڑھاتے ہی رہے۔ رسولؐ اور مسلمانوں پر طرح طرح کی تکالیف، سخت سے سخت اذیتیں، اہانت و رسوائی، بے پناہ دھمکیاں، قتل و غارت کی کوششیں، غرضکہ ہر قسم کے مصائب ڈھائے گئے لیکن جس جماعت کا رہبر و رہنما محمدؐ جیسی عدیم المثال شخصیت ہو اور وہ اُن کے درمیان اُن کی ہدایت پر مستعد رہے۔ اس کا متزلزل ہوجانا ممکن ہی نہیں ہوسکتا تھا۔ رسولؐ اسلام جب ہر قسم کی ترغیب، تحریص اور جاہ و ثروت کی ہر پیش کش کو ٹھکرا کے خود ہی شدائد مصائب جھیل رہے تھے اور برابر سے زیادہ اُن کے شریک تھے تو اُن کے ماننے والوں کی بلند حوصلگی فطری بات تھی۔ وہ پورے ایمان و اعتقاد کے ساتھ اپنے نئے عقیدے پر مستحکم رہے اور رسولؐ اسلام کے احکام پر سرِ تسلیم خم کرنا عین عبادت سمجھتے رہے۔ اُن کی اس پامردی اور ثبات نے دوسروں کو متاثر کیا جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی صفوں میں اضافے ہوتے رہے لیکن ہر اضافہ کے ساتھ کفار قریش کی

جانب سے سختیوں میں بھی زیادتی ہوتی گئی۔ چنانچہ بعثت کے پانچ برس کے بعد رسولؐ اللہ نے اپنے اصحاب کو ہجرت کا حکم دے دیا۔ اس اقدام میں مسلمانوں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ تبلیغ اسلام کی غایت بھی مقصود تھی۔ یہ لوگ صحبت رسولؐ میں اس قابل بن چکے تھے کہ جس محفل میں چلے جاتے بلندی کردار اور خوش اخلاقی وحق پرستی کی زندہ مثالیں پیش کرسکتے تھے، اس لئے اُن کی ہجرت رسولؐ کے مشن کی تکمیل میں وسیلہ بنی اور رسولؐ کا حکم پاتے ہی تخمیناً سو مرد اپنی عورتوں کو ساتھ لے کر حبشہ چلے گئے۔ وہاں کا عیسائی بادشاہ نجاشی بے حد شریف النفس اور منصف و عادل تھا۔ اُس نے ان مسلمانوں کو اپنے ملک میں پناہ دے دی لیکن کفار قریش ان مسلمانوں کی ہجرت کو بھی گوارا نہ کرسکے۔ انہوں نے اپنے ایک ایلچی کو تحائف دے کر نجاشی کے پاس اس استدعا کے ساتھ بھیجا کہ بادشاہ اُن عربی النسل مسلمانوں کو مکہ واپس کردے مگر بادشاہ نے وہ تحائف واپس کر دیئے اور مسلمانوں کو واپس بھیجنے سے انکار کردیا۔ اس طرح اسلام دوسرے ممالک میں پہنچا اور وہاں کے لوگ تعلیم رسولؐ سے متاثر ہوتے رہے۔ لاالٰہ الا اللہ کی خاموش تبلیغ ہوتی رہی، مکہ میں بھی مسلمانوں کی تعداد بڑھتی رہی اور دوسرے مقامات، مختلف اضلاع اور قریوں میں برابر لوگ مسلمان ہوتے رہے، رسولؐ اسلام کے ہاتھ پر آ آ کے بیعت کرجاتے تھے۔ ایسے لوگ انصار کہلاتے تھے اور اُن کی معقول تعداد مدینہ میں تیار ہوگئی۔ اس مقام پر یہ بات خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے کہ رسولؐ اسلام جن باتوں پر انصار سے بیعت لیتے تھے وہ یہ تھیں کہ شرک، چوری، زنا، قتل اور افترا کے مرتکب نہیں ہوں گے اور رسولؐ اللہ اُن سے جو اچھی بات کہیں گے اس سے سرتابی نہ کریں گے۔ ظاہر ہے کہ رسولؐ کے پیش نظر ایک مقدس اور پاکیزہ سماج تعمیر کرنے کا منصوبہ تھا جہاں تمام لوگ امن وسکون کی زندگی بسر کرسکیں اس لئے تبلیغ کے ابتدائی دور میں زیادہ تر توجہ ان امور پر دی گئی جو حق العباد ادا کرنے سے متعلق تھے، جتنے ارکان مذہب حقوق الٰہی سے خاصتاً متعلق تھے اُن پر زیادہ توجہ ہجرت کے بعد فرمائی گئی تھی۔ اس طریقۂ کار کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام میں جاذبیت پیدا ہوگئی اور لوگوں کے دل اس دین کی طرف جھکنے لگے۔ لیکن کفار قریش کا دل کسی طرح ملائم نہیں ہوا اور نہ اُن کے دماغ صحیح راستہ پر آنے کے لئے آمادہ ہوسکے۔ بلکہ اس کے برعکس انہوں نے رسولؐ اسلام کو قتل کردینے کا مضبوط پروگرام بنا ڈالا۔ بالآخر پیغمبر اکرمؐ کو اس کے سوا اور کوئی چارہ نظر نہیں آیا کہ وطن آبائی کو خیرباد کہہ دیا جائے۔

مدینہ میں اسلام کو پناہ مل چکی تھی، رسولؐ اسلام نے وہاں کی فضا کو سازگار پا کر مکہ سے ہجرت

فرمائی۔ ہجرت کی رات اپنے دامن میں بے پناہ وسعتیں سمیٹے ہوئے تھی۔ رسولؐ اسلام کا ترک وطن کرنا، لوگوں کے امانات کی پوری حفاظت کے ساتھ واپسی کیونکہ وہ باوجود تمام اختلافات کے تمام مکہ والوں کی نظر میں بہترین امین اور معتمد تھے، ساتھ ہی ساتھ اپنے بستر خواب کا کچھ ایسا مکمل انتظام کہ کفار قریش اُن کی عدم موجودگی محسوس نہ کرسکیں اور یہ تمام فرائض ادا کرنے کے بعد خود اس طرح مجمع چیرتے ہوئے نکل جانا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ دو مخلص دوستوں نے خاموشی اور تاریکی میں کامیاب اسکیم مرتب کی اور اس پر عمل درآمد کر ڈالا۔ رسولؐ اسلام دشمنوں کی صفوں سے اس طرح سکون و اطمینان کے ساتھ نکل گئے کہ کسی کو بھی یہ پتہ نہ چلا کون آیا اور کون گیا۔ علیؑ بستر رسولؐ پر اُن کی چادر اوڑھ کر آرام کی نیند سو رہے۔ دشمن مکان گھیرے ہوئے تھے اور اُن کے ارادے رسول اسلام کو قتل کردینے پر مستحکم و مضبوط تھے۔ وہ یہ بھی سمجھ رہے تھے کہ رسول اپنے بستر پر آرام فرما رہے ہیں، صرف وقت کا انتظار تھا کہ اپنے منصوبہ کو عملی جامہ پہنادیں اور علی اس حیات و موت کے خلفشار میں اُس پر ہول خواب گاہ پر ایسی پُرسکون اور خوشگوار نیند سوئے جیسی نہ کبھی پہلے اور نہ کبھی بعد میں اُن کو آئی تھی۔ صبح کو جب کفار قریش گھر میں گھسے تو علی کو دیکھ کر لرزہ براندام ہوگئے۔ اُن کی مایوسیوں کی کوئی انتہا نہ تھی۔ علی نے فاتحانہ انداز میں صبح کا خیر مقدم کیا۔ رات کو اپنا نفس مرضی اللہ کے عوض بیع کر فراغت حاصل کر چکے تھے، دن کو لوگوں کے امانات بحفاظت تمام اُن کو واپس کردیں اور خود بھی مدینہ روانہ ہوگئے۔ یہ ہجرت اسلامؐ کا سب سے بڑا سیاسی اقدام تھا جو انہوں نے اپنے مشن کو کامیاب بنانے کے لئے کیا۔

دورِ ہجرت کے بعد گیارہ سال کا زمانہ شدید ترین جدوجہد کا زمانہ تھا جس میں بہت سے واقعات کشمکش، سریات اور غزوات پیش آئے جن کی مجموعی تعداد غالباً بیالیس یا تینتالیس تک پہنچتی ہے سریات وہ ٹکراؤ تھے جن میں رسول اسلام نے بہ نفسِ نفیس خود شرکت نہیں فرمائی اور کسی نہ کسی کو اس خدمت کے لئے ہر موقع پر مامور فرمادیا تھا۔ سریات کی تعداد غزوات کے مقابلہ میں زیادہ تھی لیکن ہر سریہ کسی نہ کسی مقصد کے لئے عمل میں آیا تھا۔ غزوات جن میں رسولؐ نے بہ نفس نفیس سرداری کے فرائض انجام دیئے۔ بدر ۲ ہجری، احد ۳ ہجری، خندق ۵ ہجری، خیبر ۷ ہجری، فتح مکہ ۸ ہجری، حنین ۸ ہجری، تبوک ۹ ہجری اور مباہلہ ۱۰ ہجری خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں لیکن ان تمام تحریکات کا سیاسی جائزہ یہ ثابت کرتا ہے کہ مدینہ، مہاجرین اور انصار کی حفاظت کے لئے ان اقدامات کے علاوہ

اور کوئی چارۂ کار تھا ہی نہیں! مکہ کے قبائل جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا رسولؐ اسلام اور مہاجرین و انصار کے شدید ترین دشمن تھے، یہود و نصاریٰ بھی اس نئے مذہب کی ترویج و اشاعت اور ترقی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے اور ان مخالفتوں میں ان نئے آنے والوں نے، جو اسلام اور رسولؐ اسلام سے برگشتہ ہوکر مدینہ سے مکہ چلے آئے تھے اور زیادہ ہیجان اور طاقت فراہم کردی تھی۔ ان تمام حالات کے پیش نظر اشاعت دین کے ساتھ رسولؐ اسلام کے لئے یہ بھی ضروری ہوگیا تھا کہ وہ اس بات کی خبر رکھیں کہ قریش مکہ میں کیا کرتے ہیں اور کس منصوبہ میں ہیں، جو قومیں مدینہ یا مدینہ کے ارد گرد رہتی ہیں اُن سے امن اور قریش کی مدد نہ کرنے کے معاہدے کریں، جو مسلمان مکہ میں مجبوری سے رہ گئے تھے اور وہاں سے بھاگنا چاہتے ہیں ان کی ہر امکانی مدد کریں، جو گروہ قریش مدینہ پر حملہ کرنے مکہ سے باہر نکلے یا کسی طرح یہ پتہ چل جائے کہ وہ مدینہ پر حملہ کرنا چاہتا ہے اس کا ہتھیاروں سے مقابلہ کریں اور سب سے زیادہ یہ فکر تھی کہ کسی تصادم میں ضرورت سے زیادہ خونریزی نہ ہو اور انسان کے لہو کی ہر بوند گراں قدر ہی برقرار رہے۔ چنانچہ تمام سریات و غزوات کا دقیق مطالعہ واضح کرتا ہے کہ ان مقاصد کو ہمیشہ پیش نظر رکھا گیا اور اپنے جلیل القدر اصولوں کا ہر وقت احترام کیا گیا۔ رسولؐ اسلام نے خود کبھی کسی سے لڑنا پسند نہیں کیا، جنگ میں ابتداء نہیں کی تلوار کے زور سے اسلام پھیلانے کا کبھی کوئی خیال اُن کے دماغ میں نہیں آیا، حکومت قائم کرنے کا کبھی ارادہ نہیں کیا، مکہ معظمہ سے ہجرت کرکے مدینہ صرف اس غرض سے تشریف لائے تھے کہ اطمینان سے بیٹھ کر صلح و امن کے ساتھ لوگوں کو سچے مذہب کی طرف دعوت دیں لیکن کفار مکہ نے جب انہیں یہاں بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا تو انہوں نے مسلمانوں کی حفاظت کے لئے اُن کا مقابلہ کیا۔ ابوسفیان کی سرکردگی میں کفار قریش کے حملوں کا نتیجہ بدر و احد کے غزوات تھے، کفار مکہ کے ورغلانے پر یہودی برسرِ پیکار ہوئے تو رسولؐ اللہ نے مجبوراً اُن سے بھی مقابلہ کیا چنانچہ خندق و خیبر میں یہودیوں سے لڑائیاں ہوئیں جن میں اُن کے دو جاں باز عمر ابن عبدود اور مرحب مارے گئے۔ یہ فتوحات علی ابن ابی طالبؑ کے کارنامے تھے جو تاریخ اسلام میں ہمیشہ زریں حروف میں محفوظ رہیں گے، حدیبیہ میں رسولؐ اسلام نے کفارِ قریش سے صلح کرکے سیاست میں ایک ایسا نیا باب شامل کردیا جو اپنی مثال آپ تھا۔ اس وقت بڑے بڑے اولوالعزم صحابیوں کے ایمان متزلزل ہوگئے اور وہ اس صلح کی افادیت کو نہیں سمجھ سکے لیکن تاریخ شاہد ہے کہ فتح مکہ اسی صلح کا لازمی نتیجہ تھی، حنین اور مباہلہ میں عیسائیوں سے

ٹکراؤ ضرور ہوا مگر کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ پھر بھی یہ دونوں واقعات تاریخ اسلام میں اہمیت کے حامل ہیں اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ رسولؐ اسلام نے خود کو حاکم یا بادشاہ نہیں بنایا، وہ ہادی تھے اور ہادی ہی رہے۔ اگر وہ بادشاہی یا حکومت کے متمنی ہوتے تو قریش مکہ اُن کو یہ وجاہت و طاقت بخوشی و رغبت بہت پہلے ہی تفویض کر دیتے اور انہیں مکہ سے ہجرت کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی۔

رسول اسلامؐ نے جس معاشرے کی بنا ڈالی تھی اس میں نظم و نسق برقرار رکھنے کے لئے ایسے قوانین وضع کئے تھے جن میں اعتدال پسندی ملحوظ رکھی گئی تھی۔ نہ موسیٰ کی طرح سخت گیری کو شعار بنایا اور نہ عیسیٰ جیسی ''حدود سے متجاوز رحمدلی'' کو قبول فرمایا۔ انہوں نے چھوٹے چھوٹے جرائم کی سزا موت نہیں قرار دی اور نہ ایک رخسار پر تھپڑ مارنے والے کو دوسرا رخسار پیش کرنے کی ہدایت فرمائی بلکہ آنکھ کا بدلہ آنکھ، کان کا بدلہ کان، جان کا بدلہ جان کے اصول کو نافذ کیا اور ایسی سزائیں جاری کرنے میں بھی انسانی فطرت کی کمزوریاں ملحوظ رکھنے پر پورا پورا زور دیا۔ سول لا (Civil law) بھی دنیا کے سامنے پیش کیا جس کی افادیت تیرہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی مسلم الثبوت ہے۔ ان سب سے بڑھ کر ان کے رائج کردہ نظام میں یہ خصوصیت ہے کہ انہوں نے امن و آشتی اور اخوت و مساوات کی بنیادوں پر اسلامی سماج کو منظم کر دیا۔ محنت و مشقت کو مایۂ صد افتخار قرار دے کر مزدوروں کی حوصلہ افزائی کی اور اکل حلال کے حصول پر راغب کرنے میں تجارت و محنت کو وسیلۂ معاش قرار دیا۔ یہی نہیں کہ ان اصولوں کی تبلیغ و تعلیم فرمائی بلکہ بہ نفس نفیس خود عمل کر کے دنیا کے سامنے بہترین نمونہ پیش کیا۔ رسولؐ اسلام کا ذریعہ معاش ہمیشہ تجارت رہا محنت و مشقت میں مہاجرین و انصار کے برابر شریک کار رہے۔ چنانچہ ہم نے دیکھا کہ مکہ سے ہجرت کے بعد مدینہ پہنچنے سے دو میل قبل جب آپ نے مقام قبا میں قیام فرمایا اور مسجد بنانے کا فیصلہ ہوا تو تعمیر مسجد میں مزدوروں کے ساتھ آپ خود بھی برابر کے شریک کار تھے۔ بھاری بھاری پتھروں کو اٹھاتے وقت جسم مبارک خم ہو جاتا تھا۔ اسی طرح مدینہ میں قیام کے بعد جب مسجد نبویؐ تعمیر کی گئی تو رسولؐ اسلام مزدوروں کے لباس میں آگے آگے تھے۔ یہ مسجد ہر قسم کے تکلف سے بری اور اسلام کی سادگی کی بہترین مثال تھی۔ کچی اینٹوں کی دیواریں، برگ خرما کا چھپر اور کھجور کے ستون تھے۔ قبلہ ابتداءً بیت المقدس کی طرف رکھا گیا تھا لیکن دوسرے ہی سال جب ۲ ہجری میں قبلہ بدل کر کعبہ کی طرف ہوا تو شمال کی جانب ایک نیا دروازہ کھول دیا گیا۔ مسجد کے ایک سرے پر ایک مسقف چبوترہ تھا جو صفہ کہلاتا تھا۔ یہ اُن لوگوں کے لئے

تھا جو اسلام لاتے اور گھر بار نہیں رکھتے تھے۔ مسجد مکمل ہوچکی تو مسجد سے متصل ازواج نبیؐ کے گھر بنائے گئے۔ ہر مکان چھ سات ہاتھ چوڑا دس ہاتھ لانبا اور بہت نیچا تھا، آدمی کھڑا ہوکر چھت کو چھو لیتا تھا۔ دروازوں پر کمبل کا پردا پڑا رہتا تھا، راتوں کو چراغ نہیں جلتے تھے۔ اس طرح زندگی بسر کرنے کا فطری نتیجہ تھا کہ اصحاب صفہ کو بھی اپنی بے بضاعتی پر تاسف نہ ہوسکا اور وہ توکل اور قناعت کی فضیلتوں سے بہرہ یاب رہے۔

رسولؐ اسلام اور آل رسولؐ کی زندگی سادگی اور افلاس میں اپنی آپ نظیر تھی۔ وہ اپنی سادگی اور اپنی فقیری میں پُرکیف سکون حاصل کرتے تھے۔ انہوں نے الفقر فخری کو اپنا شعار بنا کر اطمینان کے ساتھ ایام گزاری کرلی۔ تاریخ ان زرین واقعات کو مسخ نہیں کرسکتی کہ جب ۲ ہجری میں رسول اسلام نے اپنی لاڈلی بیٹی سیدہ کا عقد و نکاح علیؑ کے ساتھ طے کیا تھا تو نوشاہ کی جملہ املاک ایک بھیڑ کی کھال، ایک یوسیدہ یمنی چادر اور ایک زرہ پر مشتمل تھی۔ مولانا شبلی نے سیرت النبیؐ میں ان املاک کا تذکرہ کیا ہے اور اُس زرہ کی قیمت سوا روپیہ بتائی ہے۔ یہ املاک مہر سیدہؑ میں دی گئی تھی اور جہیز میں رسولؐ اسلام نے اپنی پیاری بیٹی کو ایک بان کی چارپائی، ایک چمڑے کا گدا جس کے اندر روئی کے بجائے کھجور کے پتے بھرے تھے۔ ایک چھاگل، ایک مشک، دو چکیاں اور دو مٹی کے گھڑے مرحمت فرمائے تھے۔ آلِ رسولؐ کی فقیرانہ زندگی کے واقعات و حالات اتنی کثرت سے تاریخ کے صفحات میں ملتے ہیں جن پر تبصرہ کرنے کے لئے دفتر کے دفتر درکار ہوں گے اس موقع پر صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ یہ مثالیں اتنی بہتات کے ساتھ دنیا والوں کے سامنے اس لئے پیش کی گئی تھیں تاکہ غربت و فاقہ باعث ننگ و رسوائی قرار نہ پائیں اور بھوک کے مارے ہوئے انسانوں کے دلوں میں بھی جینے کی ہمک پیدا ہو۔ اس ایک مقصد کی وضاحت بھی الفاظ میں ممکن نہیں ہے، صرف سوچنے اور سمجھنے کی بات ہے۔

تدوین ارکان کا کام مدینہ میں مکمل ہوا تھا۔ مکہ میں بھی نمازیں پڑھی جاتی تھیں لیکن مغرب کے علاوہ ہر نماز دو رکعت کی ہوتی تھی، اذان کا کوئی طریقہ رائج نہیں ہوا تھا۔ مدینہ میں داخلہ کے ایک ماہ کے بعد نماز پنجگانہ کی سترہ رکعتیں قرار پائیں، اسی سال یعنی ۱ ہجری میں رسولؐ اللہ کے حکم سے علیؑ نے بلال کو اذان کی تعلیم دی اور بلال موذن مقرر ہوئے۔ اذان نماز جماعت قائم کرنے کے لئے رائج کی گئی تھی اور یہ ایجاد اسلام نے ایسی کی ہے جس پر دوسرے مذہب والے رشک کرتے تھے۔

مسٹر چیمبر نے اپنی انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے کہ ''موذن کی آواز سادہ لیکن نہایت متین اور دلکش ہوتی ہے۔ اگرچہ شہر میں دن کے شور وغل کے بعد بھی مسجد کی بلندی سے خوشگوار محسوس ہوتی ہے مگر رات کے سناٹے میں اس کا اثر اور بھی عجیب طور سے شاعرانہ معلوم ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ بہت سے اہل یورپ بھی پیغمبرؐ کو اس امر پر مبارکباد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انہوں نے انسانی آواز کو موسائیوں کے ترسا اور عیسائیوں کے گرجا کی گھنٹی پر ترجیح دی''۔ بہرحال پہلے سن ہجری میں نمازوں کی رکعتوں میں اضافہ ہوا، جماعت قائم کی گئی اور اذان رائج ہوئی۔ دوسرے سال یعنی ۲ ہجری میں نماز کا رخ کعبہ کی جانب موڑ کر اسی کو قبلہ قرار دیا گیا۔ اسی سال ۲ ہجری میں ماہ رمضان المبارک کے روزے فرض ہوئے۔ صدقۂ عیدالفطر اور نماز عیدالفطر کا حکم صادر ہوا۔ لیکن یہ بات قابل لحاظ ہے کہ زکوٰۃ کو روزوں پر اس طرح فضیلت ہوتی ہے کہ اس کے بارے میں ایک سال قبل یعنی ۱ ہجری ہی میں حکم دے دیا گیا تھا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حقوق العباد کی ادائیگی مقدم قرار پائی تھی۔

ہجرت کے بعد رسولؐ اسلام کی زندگی کے گیارہ برس سریا اور غزوات کی مسلسل الجھنوں میں کٹے۔ قریش مکہ سب سے بڑا دردِ سر تھے لیکن ان تمام پریشانیوں کے باوجود مدبر اعظم کا دماغ تبلیغ مذہب سے کبھی غافل نہیں ہوا۔ صلح حدیبیہ کے بعد ۶ ہجری میں جب کفار مکہ کے مدینہ پر حملہ کرنے کا خطرہ فرو ہو کر کچھ اطمینان حاصل ہوا تو رسول اسلام نے ایک مہر تیار کرائی جس پر ''محمد رسولؐ اللہ'' کندہ کرایا اور شاہان اطراف کے نام خطوط جاری کئے۔ انہیں خطوط میں ایک خط نجاشی بادشاہ حبش کے نام تھا۔ جس نے فی الفور اسلام قبول کرلیا۔ یہ واقعہ بہت مشہور ہے۔ دوسرا خط قیصر ہرقل بادشاہ روم کے نام تھا۔ قیصر کو جب یہ خط ملا تو ابوسفیان اور عرب کے کچھ تاجر اسی ملک میں اتفاق سے موجود تھے۔ وہ سب قیصر کے پاس بلائے گئے اور ان سے بھرے دربار میں حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

قیصر: تم میں سے اس مدعی نبوت کا رشتہ دار کون ہے؟

ابوسفیان: میں۔

قیصر: مدعی نبوت کا خاندان کیسا ہے؟

ابوسفیان: بہت معزز اور شریف۔

قیصر: اس خاندان میں کسی اور نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا تھا؟

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: اس خاندان میں کوئی بادشاہ گزرا ہے؟

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: جن لوگوں نے یہ مذہب قبول کیا ہے وہ کمزور لوگ ہیں یا صاحب اثر؟

ابوسفیان: کمزور لوگ ہیں۔

قیصر: وہ کبھی عہد اور اقرار کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے؟

ابوسفیان: ابھی تک تو نہیں کی لیکن اب جو نیا معاہدہ صلح ہے اس میں دیکھیں وہ عہد پر قائم رہتا ہے یا نہیں۔

قیصر: تم لوگوں نے اس سے کبھی جنگ بھی کی؟

ابوسفیان: ہاں

قیصر: نتیجہ جنگ کیا رہا؟

ابوسفیان: کبھی ہم غالب آئے اور کبھی وہ۔

قیصر: وہ تم سے کیا کہتا ہے؟

ابوسفیان: کہتا ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو، کسی اور کو خدا کا شریک نہ بناؤ، نماز پڑھو، پاک دامانی اختیار کرو، سچ بولو، صلہ رحم کرو۔

اس گفتگو کے بعد قیصر نے کہا کہ تم نے اس کو شریف النفس بتایا، پیغمبرؑ ہمیشہ اچھے خاندانوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ تم نے کہا کہ اس کے خاندان سے کسی اور نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا، اگر ایسا ہوتا تو سمجھتا کہ یہ خاندانی خیال کا اثر ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اس خاندان میں کوئی بادشاہ نہ تھا، اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اس کو بادشاہی کی ہوس ہے۔ تم مانتے ہو کہ اس نے کبھی جھوٹ نہیں کہا، جو شخص آدمیوں سے جھوٹ نہیں بولتا وہ خدا پر کیونکر جھوٹ باندھ سکتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ کمزوروں نے پیروی کی ہے، پیغمبروںؑ کے ابتداءً پیرو ہمیشہ غریب لوگ ہوتے ہیں، تم نے تسلیم کیا کہ اس کا مذہب ترقی کرتا جاتا ہے، سچے مذہب کا یہی حال ہے کہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اس نے کبھی فریب نہیں کیا، پیغمبرؑ کبھی فریب نہیں کرتے۔ تم کہتے ہو کہ وہ نماز و تقویٰ و عفاف کی ہدایت کرتا ہے، اگر یہ سچ ہے تو میری قدم گاہ تک اس کا قبضہ ہو جائے گا مجھ کو یہ ضرور خیال تھا کہ ایک پیغمبرؑ آنے والا ہے لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا۔ میں اگر وہاں جا سکتا تو خود اس کے پاؤں دھوتا۔

یہ واقعہ اور اس کے پس منظر کا تجزیہ رسولؐ اسلام کے اس طریقۂ کار پر روشنی ڈالتا ہے جس کو انہوں نے تبلیغ مذہب کے سلسلے میں اپنایا تھا۔ کہنا پڑتا ہے کہ اُن کی وفات کے بعد سے بالخصوص خلفائے بنی امیہ و بنی عباسیہ نیز دیگر مسلم سلاطین کے دور میں ترویج اسلام کے جو ڈھنگ ایجاد کیے گئے تھے وہ کم سے کم اس اسلام کو نہیں پھیلا سکے جو رسول اکرمؐ دنیا کے سامنے پیش کر گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مسلم ریاستیں بہت جلد ختم ہوگئیں اور مسلمانوں کے اقتدار سے بڑے بڑے علاقے نکل گئے۔ بہرحال رسولؐ اسلام نے جبر وتشدد کو کبھی جائز قرار نہیں دیا بلکہ اس کے برعکس حسن اخلاق اور بلندی کردار کو ترویج مذہب کا ذریعہ اور اخوت و مساوات کو تنظیم ملت کا وسیلہ بنایا تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنا پہلا یادگار درس عقد مواخات کے موقع پر ہجرت کے ۷ یا ۸ ماہ بعد دیا تھا جس کے ماتحت مسلمانوں کی تنظیم اخوت و مساوات کی بنیاد پر عمل میں آئی اور رفتہ رفتہ مسلمان سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح مستحکم و مضبوط ہوگئے۔ اُس وقت مسلمان دو ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے تھے جو مسلمان مکہ سے ہجرت کر کے آئے تھے وہ مہاجرین کہلاتے تھے اور انہوں نے مدینہ میں رہ کر اسلام قبول کیا تھا وہ انصاری کہے جاتے تھے۔ رسولؐ اسلام نے ایک ایک مہاجر کا ایک ایک انصاری سے بھائی چارہ مقرر کر دیا تھا چنانچہ تخمیناً پچاس مہاجرین کا اسی تعداد کے انصار کے ساتھ رشتۂ اخوت قائم ہوگیا۔ اس نئے رابطے نے دونوں جماعتوں کو ایک دوسرے کا ہر حال میں ہمدرد اور شریک بنا دیا۔ یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ رسولؐ اسلام کو اعلیٰ انسانیت سکھانے اور دنیاوی زندگی کو بہترین عنوان سے بسر کرنے کی تعلیم دینے کا کس قدر زبردست اور بے مثل ونظیر سلیقہ تھا۔ مولانا شبلیؒ اپنی سیرت النبیؐ میں اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ ''اسلام تہذیب و اخلاق وتکمیل فضائل کی شہنشاہی ہے، جن لوگوں میں رشتۂ اخوت قائم کیا گیا اُن میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا کہ استاد اور شاگرد میں وہ اتحاد و مذاق موجود ہو جو تربیت پذیری کے لئے ضروری ہے تفحص اور استفسار سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص جس کا بھائی بنایا گیا دونوں میں یہ اتحاد و مذاق ملحوظ رکھا گیا اور جب اس بات پر لحاظ کیا جائے کہ اتنی کم مدت میں سیکڑوں اشخاص کی طبیعت، فطرت اور مذاق کا صحیح اور پورا اندازہ کرنا تقریباً ناممکن ہے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ شانِ نبوت کی خصوصیت میں سے ہے''۔

اسی سلسلے میں یہ واقعہ بھی فوراً سامنے آجاتا ہے کہ علیؓ کے مذاق کا کوئی شخص نہ گروہ مہاجرین میں تھا اور نہ جماعت انصار میں دستیاب ہوسکا اور وہ اکیلے رہ گئے۔ جب انہوں نے پوچھا کہ یا رسولؐ

اللہ میں کس کا بھائی بنایا گیا؟ تو رسولؐ اسلام نے فرمایا: انت اخی فی الدنیا والآخرہ۔

متذکرہ بالا واقعات کی روشنی میں عہد رسالتؐ کا تاریخی جائزہ لینے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ رسولؐ اسلام نے بعثت کے بعد تیرہ سال تک اپنے ساتھیوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کی بھرپور کوشش کی، مکہ سے ابتداء ہوئی لیکن دور دور سے مشتاقان زیارت آتے رہے، بیعت کرتے اور مشرف با اسلام ہوتے گئے۔ کفار قریش نے جب عرصۂ ہستی تنگ کردیا، مکہ کی ہوا نہایت گرم اور ناموافق ہوگئی اور مدینہ میں اسلام کو پناہ ملی تو رسولؐ اسلام نے ہجرت فرمائی۔ مدینہ پہنچ کر تبلیغ مذہب حقہ تدوین ارکان دین اور تنظیم مسلمین کے امور کی طرف متوجہ ہوئے سرایات اور غزوات کے مراحل کامیابی کے ساتھ طے ہوتے رہے اور اسی کے ساتھ ساتھ بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے ایک ایسا مکمل نظام زندگی بھی تیار ہوتا رہا جس کی بنیادیں حق و صداقت، دیانت و امانت، زہد و تقویٰ، شرافت و انسانیت، پاکدامانی و حق پرستی، خود داری و خدمت خلق اور امن و آشتی کے ایسے مستحکم و مضبوط ستونوں پر استوار کی گئی تھیں، یہ تھی حقیقی سیاست اسلامیہ اور یہ تھا وہ نظام حیات جس نے عظیم الشان سلطنتوں کی طاقتوں کو ہلا دیا۔ ایروِنگ اپنی تاریخ اسلام جلد ۲ میں لکھتا ہے کہ ''اس دانائی اور سادگی کے اصول سے اُس سلطنت کی بنیاد پڑی جو قلیل مدت میں بہت عظیم الشان طاقت حاصل کرنے والی اور دنیا کی زبردست سے زبردست سلطنتوں کو ہلا دینے والی تھی''۔ لیکن پھر بھی اس طاقت کو ملوکیت اور شاہنشاہیت سے کوئی سروکار نہ تھا۔ دس برس کی مدت میں جب یہ مشن کامیاب ہوگیا، اسلام کی مقدس اور پاکیزہ عمارت پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تو ۱۱ ہجری میں حجۃ الوداع سے فارغ ہوکر رسولؐ اسلام نے اپنی اس متاع زندگی کی حفاظت و بقا اور مسلمانوں کی رہبری و رہنمائی کے لئے خلق کی ایسی ممتاز ترین اور مایۂ ناز شخصیت کو، جو ہر گرم و سرد میں اور ہر نازک سے نازک موقع پر رسولؐ کے شریک کار رہ چکے تھے اور مقصد رسولؐ سے کماحقہ واقف تھے۔ اپنا وصی و جانشین مقرر کرکے اس دار فانی سے رحلت فرمائی۔ پیغمبر اسلام نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کے ذریعہ جس وسیع اسلامی سماج کی تعمیر و تشکیل کی تھی اس کی ہدایت و رہنمائی کوئی معمولی بات نہ تھی ذرا سی کوتاہی ان کی ساری محنت کو رائگاں کرسکتی تھی۔ اس حقیقت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے انہوں نے غدیر خم کے میدان میں اعلانیہ اپنے جانشین کی نشاندہی کردی تھی تاکہ ہدایت و رہنمائی کے باب میں کوئی کمی واقع نہ ہونے پائے اور اگر اسلام دشمن طاقتیں اپنے سازشانہ منصوبوں کے ذریعہ اسلام کو انحراف سے دوچار کرنا چاہیں تو علی اور اولاد علی پیغمبر کی اس گرانقدر الٰہی

امانت کی حفاظت کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کردیں۔

مسجد کوفہ میں سجدہ کی حالت میں سر پر گہری ضرب لگنے کے بعد ''کعبہ کے رب کی قسم میں کامیاب ہوگیا'' کا نعرہ اس بات کی دلیل ہے کہ علیؑ کی زندگی کا مقصد اسلام کی حفاظت اور ملت اسلامیہ کی قیادت و رہنمائی تھا۔ اس عظیم مشن کی تکمیل کی ذمہ داری امام حسنؑ نے قبول کی اور ان کے بعد امام حسینؑ نے کربلا کے میدان میں اسلام کا ایسا بیمہ کردیا کہ اب قیامت تک کسی یزید میں مسلمانوں سے طلب بیعت کی ہمت نہ ہوگی یہاں تک کہ قائم آل محمد کا ظہور عمل میں آجائے اور بندگان خدا کو ظلم و ناانصافی سے مکمل نجات حاصل ہوجائے۔